

مسئلہ اجتہاد و تقلید کا صحیح معنی و مفہوم

عابد جمشید رانا

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله المنعم المحسن الذي جعل لكل أمة شرعة ومنهاجا وقد نشأتنا في أمة نبيه الأكرم خاتم المرسلين صلى الله عليه وسلم امتنانا وإبهاجا وزاد الإحسان والامتنان حيث أخرجنا لسائر الناس إخراجا وأكمل الصلوة والسلام وأحسنها على محمد بن المصطفى الذي على رأس الساعة مبعوث وبإمامة الأنبياء والأسوة الحسنة والنطق بوحى يوحى منعوت ورضوان الله جل شأنه على آلہ وأزواجه وأصحابه الذين هم قدوة الأنام وكانوا أنصار الإسلام حين كان غريبا حتى في بيت الله الحرام وعلى الآخرين الذين اتبعوهم بإحسان، ولما يلحقوا بهم، إلى يوم الدين. أما بعد

اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسانیت کی ابدی فوز و فلاح کے لیے امام الانبیاء صلی اللہ علیہ و علی آلہ وسلم کو کتاب ہدایت دے کر مبعوث فرمایا جس میں گذشتہ قوموں کے حالات بھی ہیں اور آنے والے ایام کی خبریں بھی، موعظ و نصیحت بھی ہے اور زندگی گزارنے کے ڈھنگ بھی۔ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے اقوال و افعال کے ذریعے قرآن کریم کی تشریح و تفسیر اور دین متین کی تکمیل کا فریضہ سرانجام دیا اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت بابرکات میں دین کو اس کی اصلی اور مکمل حالت میں سیکھا اور پوری ذمہ داری سے آگے منتقل کر دیا۔ تعلیم و تعلم کی شاہراہ پر یہ سفر تسلسل سے جاری ہے اور قیامت تک راہ حق کے مسافر حسب ارشاد نبوی یحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين وتأويل الجاهليين وانتحال المبطلين اس کو نہ صرف آباد رکھیں گے بلکہ اس کے محافظین کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے اس کو راہزنوں سے بھی محفوظ رکھیں گے۔

فقہائے اسلام نے قرآن و سنت سے مستنبط اصول و قواعد کی روشنی میں شریعت مطہرہ کی فروع و جزئیات کو مدون و منضبط شکل میں امت کے سامنے پیش کیا۔ ان فقہاء کی امانت و دیانت، ان کا علم و فضل، ان کی قوت استنباط و استدلال اور نباضی ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے اور یہ اسی علمی زنجیر، سلسلۃ الذہب اور جبل اللہ المتین کی ایک مضبوط کڑی ہیں جس کے وجود مسعود کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے إنما العلم بالتعلم کی سند امتیاز حاصل ہے۔ لیکن تکنیکی طور پر ایسا انتظام ہوا اور اس قافلہ حق کے سالاروں اور پاسبانوں میں سے چند ایک کو بارگاہ ایزدی سے خصوصی انعام کے طور پر یہ شرف حاصل ہوا کہ ان کے مستنبط شدہ اور مقرر کردہ اصول و قواعد اور اجتہادات کے ذریعے مدون و مرتب ان کے مذاہب کو باقی رکھا گیا۔ دیگر مجتہدین کے مذاہب نہ تو مدون و مرتب ہوئے اور نہ باقی رہے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ مٹ گئے اور اب ان کا ذکر صرف کتابوں میں ہی ملتا ہے۔ ان منعم علیہم ائمہ میں امام ابوحنیفہ، امام مالک بن انس، امام محمد بن ادریس شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ شامل ہیں۔

ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

بارہ سو سال سے زائد عرصہ سے امت نے اپنے تمام تر مسائل کے حل کے لیے مذاہب اربعہ کے فقہاء پر ہی اعتماد کیا ہے۔ لیکن کچھ عرصہ سے بعض جالبوں نے تقلید کو شرک اور نجائے کیا کچھ کہہ کر اس کا انکار شروع کر دیا ہے اور دوسری طرف بعض نفس پرست جن کو قرآن و سنت کی صحیح سمجھ بوجھ سے دور کا واسطہ بھی نہیں وہ اپنے تئیں مجتہد بنے بیٹھے ہیں۔ معاذ اللہ کیا تمام امت صدیوں سے شرک میں مبتلا تھی؟؟ کہ اب چودہ سو سال گزرنے کے بعد چند ”موحد“ پیدا ہوئے اور باقی امت کو ”شرک“ سے نکال کر اپنی نام نہاد ”توحید“ میں داخل کرنے کے لیے تقلید کے مسلمہ اور اجماعی مسئلہ کا انکار کرنے

لگے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ تقلید کا صحیح مفہوم واضح کیا جائے اور قرآن و سنت اور ائمہ سلف سے اس کی مشروعیت کو ثابت کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ سمجھ عطا فرمائیں۔

سطور ذیل میں ہم صرف تقلید کا صحیح معنی و مفہوم بیان کریں گے۔ مخالفین کے اعتراضات، ان کی تلمیسات اور غلط مفہیم کو ان شاء اللہ پھر کبھی زیر بحث لایا جائے گا۔ البتہ اتنی بات جان لینا ضروری ہے کہ مخالفین تقلید جن ائمہ کی عبارات کو آگے پیچھے سے کاٹ کر اپنا من پسند مفہوم نکالنے کی کوشش کرتے ہیں وہ تمام ائمہ کسی نہ کسی امام کے مقلد ہی تھے۔ امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام ابن ماجہ، امام ابو داؤد، امام نسائی، امام آلوسی، امام سیوطی، امام طحاوی، امام نووی سے لے کر امام شاہ ولی اللہ دہلوی تک کون سے بزرگ ایسے ہیں جو مقلد نہیں تھے؟؟؟؟ مزے کی بات تو یہ ہے کہ موجودہ دور کے مخالفین تقلید جس ہستی کو اپنا سب سے بڑا رہبر مانتے ہیں اور تقریر و تحریر میں ان کی کتب کے حوالے دیتے نہیں تھکتے؛ یعنی امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ؛ وہ بھی مقلد تھے!!! فی اللجب!!!

خدا کی قدرت تو دیکھیے کہ کلچری گنجی
کرے ہے حضورِ بلبل سرا نغمہ سنجی

اجتہاد

تعارف:

لغوی معنی:

اجتہاد کے لغوی معنی ہیں کسی کام میں اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر دینا اور حتی المقدور اس کام کی تحقیق و تفتیش اور بجا آوری میں کوشش کرنا۔ خواہ یہ کوشش کسی حسی امر میں ہو یعنی کوئی مشقت والا کام کرنا مثلاً کتوں کھودنا، عمارت تعمیر کرنا وغیرہ۔ خواہ یہ کوشش کسی ایسے معاملے میں کی جائے جو معنوی ہو۔ مثلاً خوب غور و فکر کر کے کسی پیش آمدہ مسئلے کا حل تلاش کرنا یا کوئی نظریہ قائم کرنا یا کوئی شرعی یا لغوی حکم بتلانا۔

محمد بن ابی بکر الرازی کہتے ہیں

الاجتهاد والتجاهد بذل الوسع والمجهود.

(مختار الصحاح ۴۸/۱)

’اجتہاد اور تجاہد‘ کا معنی ہے اپنی پوری طاقت و قوت کو بروئے کار لانا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ’اجتہاد‘ کا لفظ ان الفاظ میں شامل ہے جن کے لغوی معانی پر شرعی معانی غالب آگئے ہیں۔

لسان العرب میں ہے

والمراد به رد القضية التي تعرض للحاكم من طريق القياس الى الكتاب والسنة ولم يرد الرأي الذي راه من قبل

نفسه من غير حمل على الكتاب او السنة.

(لسان العرب ۳/۱۳۳)

اجتہاد سے مراد ہے حاکم کے سامنے پیش ہونے والے معاملے کو عقل و قیاس کی روشنی میں کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کرنا اور قرآن کریم اور سنت سے راہنمائی لیے بغیر محض اپنی ذاتی رائے سے اس کا فیصلہ نہ کرنا۔

اصطلاحی معنی:

علامہ علی بن محمد آمدیؒ فرماتے ہیں

وامافی اصطلاح الأصولیین فمخصوص باستفراغ الوسع فی طلب الظن بشیء من الأحکام الشرعیة علی وجه یحس من النفس العجز عن المزیّد فیہ۔

(الإحکام فی أصول الأحکام ۱۴۹/۲)

اصولیین کی اصطلاح میں اجتہاد کا لفظ احکام شرعیہ میں سے کسی چیز کا حکم علی وجہ الظن جاننے کے لیے اپنی تمام تر توانائیوں کو صرف کر دینے کے لیے خاص ہے اور یہ کوشش اس طور پر ہو کہ اس سے زیادہ کوشش کرنا انسانی قدرت سے باہر ہو۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں

هو استفراغ الوسع فی النظر فیما لا یلحقه فیہ لوم مع استفراغ الوسع فیہ۔

(المحصول ۹/۶)

اجتہاد غور و فکر میں پوری قوت کے صرف کر دینے کو کہتے ہیں کہ جس میں کوئی کجی نہ رہ جائے۔

ابن قدامہ مقدسی کے نزدیک

وهو فی عرف الفقهاء مخصوص ببذل الجهد فی العلم بأحکام الشرع

(الاحکام فی أصول الأحکام ۱۴۹/۲)

اجتہاد فقہاء کے عرف میں احکام شریعت کو معلوم کرنے کی کوشش کرنے کا نام ہے۔

اور بعض علماء نے اس کی یہ تعریف کی ہے

هو ملکہ یقتدر بہا علی استنباط الأحکام الشرعیة العملية من أدلتها التفصیلیة۔

(القول المفید ۳۰/۱)

اجتہاد اس صلاحیت کا نام ہے جس کے ذریعے شریعت کے عملی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل سے مستنبط کرنے

کی قدرت پیدا ہو جاتی ہے۔

مشروعیت اجتہاد

اللہ رب العزت نے اسلام کو آخری دین اور اس امت کو آخری امت ہونے کا شرف عطا فرمایا ہے یہ دین قیامت تک کے لیے ہر دور اور ہر ہر خطے کے تمام افراد کے تمام مسائل کا حل پیش کرتا ہے چونکہ یہ بدیہی اور مسلمہ بات ہے کہ مسائل غیر محدود اور قرآن و سنت کی نصوص محدود ہیں۔ لہذا اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اجتہاد کو مشروع قرار دیا جائے اور اس کے ذریعے پیش آمدہ نئے مسائل کا حل دریافت کیا جائے۔ پچھلے باب میں ہم اس بات کا تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے اجتہادات کیے اور دربار نبوت سے انہیں سند تو ثیق عطا ہوئی۔ یہاں ہم کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عقل کی روشنی میں اجتہاد کا مشروع ہونا ثابت کریں گے۔

کتاب اللہ اور مشروعیت اجتہاد

قرآن مجید فرقان حمید میں اللہ تبارک تعالیٰ نے کئی مقامات پر غور و فکر کرنے اور تدبر کا حکم دیا ہے۔

سورۃ النساء میں ارشاد ہوتا ہے

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ.

(النساء ۴: ۱۰۵)

بے شک ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کتاب بھیجی ہے تاکہ آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم لوگوں کے

درمیان فیصلہ کریں بایں طور کہ جو اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو دکھائے۔

علامہ آمدیؒ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں

يعم الحكم بالنص والا ستنباط من النصوص .

(الإحكام في أصول الأحكام ۱/۲۷۴)

حکم عام ہے، نصوص کے مطابق فیصلہ کرنا اور نصوص سے استنباط کرنا دونوں اس میں داخل ہیں۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ

(آل عمران ۳: ۱۵۹)

اور ان (صحابہ رضی اللہ عنہم) سے امور میں مشورہ لیتے رہیے۔

وَأْمُرْهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ

(الشوریٰ ۴۲: ۳۸)

اور ان مسلمانوں کے جملہ امور باہم مشورہ سے طے پاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ مشورہ کے لیے ضروری ہے کہ پیش آمدہ مسائل پر بحث و تجویز سے کام لیا جائے تاکہ صحیح اور غلط امور میں تمیز ہو سکے اور ان امور کو شریعت کے ادلہ کی روشنی میں پرکھا جائے خواہ یہ ادلہ منصوص ہوں یا غیر منصوص۔ دونوں صورتوں میں ان پیش آمدہ مسائل کے مالھا و ما علیھا کا جائزہ لیا جائے اور یہ پورا عمل اہل الرائے کی موجودگی میں ہی ہو سکتا ہے ایسے اہل الرائے افراد جو فی الواقع اہلیت اجتہاد رکھتے ہوں۔

علامہ آمدی نے اس عنوان کے تحت مزید بہت سی آیات ذکر کی ہیں اور ان سے مشروعیت اجتہاد کو ثابت کیا ہے۔ یہاں ہمارا مقصد ان چند مثالوں کو پیش کرنے سے یہ دکھانا تھا کہ قرآن کریم نے بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے بھی دور نبوی صلی اللہ علیہ والہ وسلم ہی کی طرح اجتہاد کی گنجائش کو باقی رکھا۔

سنت نبویہ اور مشروعیت اجتہاد

ذخیرہ احادیث مبارکہ میں ایسی بہت سی احادیث ملتی ہیں جن سے صراحتاً اجتہاد کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔

عن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ انه سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم يقول: اذا احکم الحاكم

فاجتهد فاصاب فله اجران واذا احکم فاجتهد ثم اخطأ فله اجر .

(صحيح البخارى باب أجر الحاكم اذا اجتهد ؛ سنن الترمذی باب ما جاء فى القاضی یصیب ویخطئ)

جب کوئی حاکم فیصلہ کرنے میں اجتہاد سے کام لے اور صحیح فیصلہ کرے تو اس کو دواجر ملیں گے اور اگر وہ اجتہاد سے فیصلہ کرنے میں غلطی کر جائے تو اس کو ایک اجر ملے گا۔

اس حدیث مبارکہ سے اجتہاد کی مشروعیت اتنی صراحت سے ثابت ہوتی ہے کہ اس کا انکار کرنا سورج سے آنکھیں بند کر لینے کے مترادف ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ مشہور و معروف ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ان کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو ان سے سوال کیا کہ اگر کوئی مقدمہ پیش ہو تو فیصلہ کیسے کرو گے۔ آپؐ نے بالترتیب کتاب اللہ اور سنت کا نام لیا پھر فرمایا کہ اگر کوئی مسئلہ ان میں نہ ملے تو اجتہد برأیی ولا آلو

(سنن أبی داود باب اجتہاد الرأی فی القضاء)

میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کوتاہی نہ کروں گا۔ ایسی احادیث تو احاطہ شمار سے باہر ہیں جن سے اجتہاد کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔ یہاں مثال کے طور پر محض دو احادیث کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مشروعیت اجتہاد اور تقاضائے عقل

جب ہم دین اسلام کو آخری دین اور امت محمدیہ کو آخری امت تسلیم کرتے ہیں تو اجتہاد کی مشروعیت کو تسلیم کرنا اس کا لازمی نتیجہ ہے کیونکہ نوازل و حوادث لامحدود اور نصوص محدود ہیں۔ امام سیوطیؒ نے اس سلسلے میں بڑی جامع بات کی ہے۔ فرماتے ہیں

نعلم قطعاً و یقیناً الحوادث والوقائع فی العبادات والتفرقات مما لا یقبل الحصر ولذا نعلم ایضاً انه لم یرد فی کل حادثۃ نص ولا یتصور ذلک ایضاً۔ والنصوص اذا كانت متناهیة وما لا یتناهی لا یضبطہ ما یتناهی علم قطعاً ان الاجتہاد والقیاس واجب الاعتبار حتی یکون بعدد کل حادثۃ اجتہاد۔

(تقریر الاستناد فی تفسیر الاجتہاد ۳۰/۱)

ہمیں یہ بات قطعی و یقین طور پر معلوم ہے کہ عبادات اور معاملات میں نئے پیش آمدہ مسائل و واقعات احاطہ شمار سے باہر ہیں اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر نئے پیش آنے والے مسئلہ کے بارے میں نص نہیں وارد ہوتی اور اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ (ایسا ممکن بھی نہیں ہے) تو چونکہ نصوص محدود ہیں اور مسائل و حوادث غیر محدود اور محدود غیر محدود کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ لہذا یہ بات ثابت ہوئی کہ بیشک اجتہاد اور قیاس کو معتبر مانا جائے گا تاکہ ہر نئے پیش آنے والے مسئلہ کے بارے میں اجتہاد (غور و فکر) کے ذریعے فیصلہ کیا جاسکے۔

اجتہاد کی شرائط

اجتہاد جیسا اہم منصب جس پر ملت بیضاء اور شریعت مطہرہ کی حیات معنوی کا دار و مدار ہے اور جس کے ذریعے ہر دور میں پیش آمدہ مسائل و واقعات کی باگیں موڑ کر ان کو دین فطرت کی راہ پر گامزن ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے، کا ہر کس و نا کس اہل نہیں ہے بلکہ علماء امت رحمہم اللہ نے اس کے لیے بہت سی شروط کو معتبر ٹھہرایا ہے اور اس منصب جلیلہ پر فائز ہونے کے لیے جن صفات سے متصف ہونا لازمی ہے ان صفات کو مفصل بیان کیا ہے۔ اہل علم نے مجتہد کے لیے جن شرائط کا جامع ہونا ضروری قرار دیا ہے ان کو دو بنیادی قسموں میں منحصر کیا جاسکتا ہے۔

شروطِ شخصیہ

شروطِ شخصیہ سے مراد وہ فطری صلاحیتیں اور قدرتی استعداد ہے جس کا حامل شخص اجتہاد جیسے منصب پر فائز ہونے کے اہل ثابت ہو سکتا ہے اگر وہ ان کے ساتھ ساتھ شروطِ علمیہ پر بھی پورا اترتا ہو۔

شروطِ علمیہ

عموماً شروطِ مجتہد سے مراد یہی شروطِ علمیہ لی جاتی ہیں۔ ذیل میں ان شرائط کو مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ لغت عرب میں مہارت تامہ

مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ لغت عرب میں مہارت تامہ رکھتا ہو، عربی محاورات کے استعمال سے واقف ہو، خصوصاً زمانہ جاہلیت کی شاعری، زور آور خطباء کے خطبات اور عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم میں مستعمل جملہ محاورات اور طرق کلام سے واقف ہو کیونکہ قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا اور اس کی اولین اور مستند ترین شرح زبان نبوت صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے صادر ہوئی جو بلا شک و شبہ و مرأء فصیح العرب تھے۔

كما قال صلى الله عليه وسلم

أنا أفصح العرب

(تلخیص الحبیر ۶/۴)

میں تمام عرب سے زیادہ فصیح ہوں۔

اور قرآن کریم نے اپنے بارے میں کہا ہے:

وَإِنَّهُ لَنَزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ ۝

(الشعراء ۲۶ : ۱۹۲)

بے شک یہ قرآن دونوں جہانوں کے مالک کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ اس کو جبریل امین علیہ السلام سے کراترے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے قلب اطہر پر، تاکہ آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں اور یہ قرآن واضح اور فصیح عربی زبان میں ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں

أحدها يكون عارفاً بمقتضى اللفظ ومعناه

(المحصول ۳۰/۲)

امام رازی کے علاوہ اس شرط کو محمد بن اسماعیل صنعانی اور منصور بن محمد السمعانی نے بھی ذکر کیا ہے۔

(ارشاد النقاد ۱۳۳/۱ قواطع الأدلة في الأصول ۱۰۴/۲)

۲۔ عالم بالتفسير وعلوم القرآن

مجتہد کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کا بلند پایہ عالم ہو خصوصاً آیات احکام کی تفسیرات و تعبیرات سے آگاہ ہو اور ان آیات کی تہ

میں چھپے گوہر ہائے مقصود تک پہنچنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو۔ نظم قرآنی کے عموم و خصوص، مطلق و مقید، محکم و متشابہ، ناسخ و منسوخ اور ان جملہ بحث سے واقف ہو جن کا جاننا خصوصاً آیات احکام کی صحیح الہی مراد تک پہنچنے کے لیے لازمی ہو۔

(تقریر الاستناد فی تفسیر الاجتہاد ۳۸/۱ المحصول ۳۳/۶)

اس کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کی زبان نبوت سے صادر تشریحات و تعبیرات اور صحابہؓ کے تفسیری اقوال سے آگاہ ہو کیونکہ یہ لوگ نزول قرآن کے عینی گواہ اور بارگاہ نبوت کے تربیت یافتہ تھے۔ زمانہ نزول قرآن کے حاضر باش گواہان کی حیثیت سے تفسیر قرآن میں بہر حال ان حضرات کے اقوال کو مابعد کے افراد پر جو تقدم حاصل ہے اس کا ثبوت کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں۔

۳۔ عالم بالسنة

مجتہد کے لیے شرط ثالث یہ ہے کہ وہ سنت نبویہ علی صاحبہا الف الف الصلوٰۃ والسلام کا عالم ہو۔ سنت قولیہ، فعلیہ اور تقریریہ تینوں اقسام سے بخوبی واقف ہو۔ روایت اور درایت کے اصولوں سے آشنا ہو۔ اسی طرح احادیث مبارکہ میں سے ناسخ و منسوخ، عام و خاص، مطلق و مقید، طرق روایات اور اسناد احادیث کا عالم ہو نیز علوم الحدیث کی جملہ انواع سے واقف ہو۔

(المحصول ۳۳/۶)

کیونکہ سنت نبویہ علی صاحبہا الف الف الصلوٰۃ والسلام مصادر شرعیہ میں سے دوسرا مصدر اور ملت بیضاء کی بنیادوں میں سے دوسری اہم ترین بنیاد ہے کہ اس سے ناواقف شخص دین پر عمل کرنا تو کجا اس کا صحیح مفہوم سمجھنے پر بھی قادر نہیں ہو سکتا۔ امام سمعانی نے عالم بالسنة کے لیے پانچ شرائط کو ذکر کیا ہے

احدها معرفة طرقها من تواتر و آحاد ليكون المتواتر معلومة والآحاد مظنونة والثاني معرفة طرق الآحاد ومعرفة روايتها ليعمل بالصحيح منه ويعدل عن ما لا يصح منه والثالث ان يعرف أحكام الأفعال والأقوال ليعلم بما يوجب كل واحد منهما والرابع ان يحفظ معاني ما انتفى الاحتمال عنه ويحفظ الفاظ ما دخله الاحتمال ولا يلزمه حفظ الأسانيد وأسماء الرواة اذا عرف عدالتهم والخامس ترجيح ما يعارض من الأخبار لياخذ ما يلزمه العمل به.

(قواطع الأدلة في الأصول ۳۰۵/۲)

ان میں سے ایک متواتر اور آحاد کے طرق کی پہچان ہے تاکہ متواتر کا علم ہو سکے اور خبر واحد کو ظن کے درجے میں رکھا جاسکے۔ دوسری شرط خبر واحد کے طرق کی صحت کی پہچان اور اس کے راویوں کی معرفت ہے تاکہ غیر صحیح سے بچتے ہوئے صحیح پر عمل کیا جاسکے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ وہ فعلی و قولی احکام کو جانتا ہو تاکہ ان کے موجب پر مطلع ہو سکے چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ الفاظ کے معانی کو ان کے احتمال اور عدم احتمال کو جانتا ہو۔ سندوں اور راویوں کے ناموں کو جب کہ ان کی عدالت معروف ہو یا ذکرنا ضروری نہیں۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ وہ باہم معارض احادیث میں ترجیح دے سکتا ہو تاکہ اس حدیث کو لے سکے جس پر عمل کرنا لازمی ہے۔

۴۔ عالم باصول الفقه

مجتہد کے لیے شرط علمیہ سے اہم ترین شرط یہ ہے کہ وہ علم اصول فقہ سے واقف ہو کیونکہ اس علم کے ذریعہ سے ہی قوت استدلال پیدا ہوتی ہے۔ اور دلائل سے احکام کا استنباط ممکن ہوتا ہے۔ مجتہد کو اصول فقہ کی تمام ابحاث سے مکاتفہ آگاہ ہونا چاہیے تاکہ ادلہ اربعہ متفق علیہا یعنی قرآن، سنت، اجماع

اور قیاس اور مختلف فیہا اولہ یعنی استحسان، مصالح مرسلہ، شرائع من قبلنا، استصحاب اور عرف وغیرہ سے مسائل شرعیہ کا حل نکالنے پر قادر ہو۔ نیز اس کے لیے لازم ہے کہ وہ جملہ شروط استدلال سے آشنا ہو اور الفاظ سے متعلق جملہ مباحث، امر، نہی، عام، خاص، مطلق، مقید، منطوق، مفہوم، ظاہر، نص، مفسر، محکم، تشابہ، مؤول وغیرہ اسے آگاہ ہو اور قیاس شرعی کے جملہ ضوابط سے آشنا ہو۔

(ارشاد النقاد ۱۳۴/۱ تقریر الاستناد فی تفسیر الاجتہاد ۳۴/۱)

۵۔ عالم باجماع الامت

مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ مواضع اجماع اور علمائے امت کے مواضع خلاف سے آگاہ ہوتا کہ اجماعی امور میں اجتہاد کر کے ان کے خلاف فتویٰ نہ دے بیٹھے اور اس طرح اجماع امت کے خلاف کر کے جادہ حق سے نہ ہٹ جائے۔

امام رازی فرماتے ہیں

واما الإجماع فينبغي أن يكون عالما بمواقع الإجماع حتى لا يفتي بخلاف الإجماع وطريق ذلك أن لا يفتي إلا بشيء يوافق قول واحد من العلماء المتقدمين أو يغلب على ظنه أنه واقعة متولدة في هذا العصر ولم يكن لأهل الإجماع فيها خوض.

(المحصول ۳۴/۶)

جہاں تک اجماع کا تعلق ہے تو مناسب ہے کہ وہ اجماع کے مواقع سے واقف ہوتا کہ اجماع کے خلاف فتویٰ نہ دے بیٹھے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ متقدمین علماء کی آراء کے مطابق ہی فتویٰ دے سوائے اس صورت کے کہ اس کو یقین ہو جائے کہ یہ واقعہ اسی دور میں رونما ہوا ہے اور اس سے پہلے اہل اجماع نے اس مسئلہ میں غور و خوض نہیں کیا۔

امام سمعانی فرماتے ہیں

واما الشرط الرابع فهو معرفة الإجماع والاختلاف وما ينعقد به الإجماع وما لا ينعقد به... ليتبع الإجماع و يجتهد في الاختلاف.

(قواطع الأدلة في الأصول ۳۰۶/۲)

اور چوتھی شرط اجماع و اختلاف اور ان کے آلات اور طریقوں کو جاننا ہے تاکہ اجماع کی پیروی کر سکے اور اختلافی مسائل میں اجتہاد کر سکے۔

۶۔ عالم بزمانہ

علمائے اصولیین نے مجتہد کے لیے جو شرائط ذکر کی ہیں ان میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ مجتہد اپنے زمانہ کے احوال اور لوگوں کے جملہ معاملات سے آگاہ ہو کیونکہ قاعدہ ہے

من جہل باہل زمانہ فہو جاہل

(حاشیہ ابن عابدین ۳۵۹/۵)

جو اپنے زمانہ کے لوگوں کے احوال سے آشنا نہیں وہ جاہل ہے (عالم نہیں)۔

کیونکہ مجتہد کسی خدائی اور افسانوی مسئلے پر اجتہاد نہیں کرتا بلکہ اس کے سامنے آنے والے مسائل ہوتے ہیں۔ پس اگر وہ اسے

زمانے کے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور عمرانی حالات سے ناواقف ہو تو وہ کس طرح فتویٰ کا اہل ہو سکے گا؟
ابن قیم فرماتے ہیں

فهذا أصل عظیم یحتاج إلیہ المفتی والحاکم وإلا کان ما یفسد اکثر مما یصلح فإنه إذا لم یکن فقیهاً فی الأمور له معرفة بالناس تصور له الظالم لصورة مظلوم و عکس والمحقق بصورة المبتطل و عکسها.
(إعلام الموقعین ۲۰۴/۴)

پس یہ ایک عظیم اصل ہے جس کی ضرورت مفتی اور حاکم کو پیش آتی ہے ورنہ وہ اچھائیوں سے زیادہ بگاڑ پیدا کرے گا کیونکہ اگر وہ لوگوں کے معاملات سے ناواقف ہوگا تو اسکو ظالم مظلوم کی شکل میں نظر آئے گا ورنہ مظلوم ظالم کی شکل میں اسی طرح غلط صحیح نظر آئے گا اور صحیح غلط۔

۷۔ صحت نیت

مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ اس کی نیت خالص ہو کیونکہ اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کی عزت اس کے شامل حال نہیں ہو سکتی اور وہ تلاش حق کے سفر میں نور الہی کو چراغ راہ نہیں بنا سکتا۔ صحیح نیت کے ساتھ جب تقویٰ کی دولت مہیا ہو جائے تو شاہراہ حق کا سفر نور الہی کی روشنی میں منزل مقصود کی طرف گامزن رہتا ہے۔

کما قال تعالیٰ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا
(الأنفال ۸ : ۲۹)

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہارے لیے حق و باطل میں تمیز ممکن کر دے گا۔

۸۔ عالم بمقاصد الشریعہ

مجتہد کے لیے ضروری ہے وہ شرعی احکام کے مصالح اور مقاصد سے واقف ہو اور مصالح کی رعایت کے تینوں درجات یعنی ضروریات، حاجیات، اور تحسینات سے واقف ہو اور ان مقاصد کے مقتضیات یعنی رفع الحرج، منع الضیق وغیرہ سے آشنا ہو۔

اس شرط کو امام شاطبیؒ اور سمعانیؒ نے ذکر کیا ہے

(إرشاد النقاد ۹/۱ الموافقات ۱۶۲/۴)

ان شرائط کے بیان کے بعد ہم یہ پوچھنے میں یقیناً حق بجانب ہیں کہ تقلید کے مخالفین جو ہر کس و نا کس کو خود اجتہاد کرنے کی ترغیب دیتے رہتے ہیں اور ائمہ کی تقلید کو شرک کہہ کر اس سے روکتے ہیں وہ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ ان شرائط میں سے کتنی شرائط ان میں پائی جاتی ہیں !!! بلکہ ان شرائط کا پایا جانا تو دور کی بات ہے انہیں تو ان شرائط کے معنی و مفہوم کا بھی شاید صحیح طور پر علم نہ ہو !!!

تقلید

لغوی معنی

’التقليد‘ باب تفعیل کا مصدر ہے اور اس کا مادہ ’قل‘ دُہے۔ ثلاثی مجرد سے اس کا باب ضرب یضرب آتا ہے۔ اس کا معنی ہے اُنڈیلنا، ڈالنا۔ ابن المنطور الافریقی فرماتے ہیں

القلد جمع الماء فی الشیء یقال قلدت أقلد قلداً أى جمعت ماء إلى ماء.

(لسان العرب ۳/۳۶۵)

قلد کسی چیز میں پانی کے جمع کرنے کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے قلدت أقلد قلداً یعنی میں نے پانی کو پانی میں ڈالا۔ مزید لکھتے ہیں

قلد الماء فی الحوض واللبن فی السقاء والسمن فی النحی.

(المرجع السابق)

حوض میں پانی ڈالنا، برتن میں دودھ یا گھی اُنڈیلنا۔

یہ لفظ جب ثلاثی مزید کے باب تفعیل میں جاتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں گلے میں ہار ڈالنا، جانور کے گلے میں رسی وغیرہ ڈالنا اور کسی کو کوئی کام سپرد کرنا۔

لسان العرب میں ہے

قلده قلاداً وتقلدها ومنه التقليد فی الدین وتقلید الولاة الأعمال وتقلید البدن أن یجعل فی عنقها شعار یعلم به

أنها هدی... وقلده الأمر ألزمه إياه

(المرجع السابق)

اور اس سے دینی امور میں تقلید مراد ہے اور حکام کو امور کا سپرد کرنا بھی اسی سے ہے۔ قربانی کے جانوروں کی تقلید سے مراد ہے ان کے گلے میں ہار ڈالے جائیں تاکہ پتہ چل جائے کہ یہ حج کے لیے جا رہے ہیں۔۔۔ اور قلده الأمر سے مراد ہے کسی کے ذمے کام لگا دینا۔

یاد رہے کہ ”قلادة“ کی نسبت جب انسان کی طرف ہو تو اس سے مراد گلے میں ہار ڈالنا ہوتا ہے، پٹہ ڈالنا نہیں۔

حکم تیمم کے نزول کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں

ثم سقطت قلادة لی بالبيداء ونحن دا خلون المدينة.

(صحيح البخاری باب قوله تعالى فلم تجدوا ماء)

پھر بیداء نامی جگہ میں میرا ہار گر گیا اور ہم اس وقت مدینہ منورہ میں داخل ہونے والے تھے۔

مختار الصحاح میں ہے

القلادة التي فی العنق.

قالا، گر، ۱۰، ۱، کر، ار، کہتے ہیں،

(مختار الصحاح ۲۲۹/۱)

وہ لوگ جو تقلید کے لفظ کا مطلب گلے میں پٹہ ڈالنا بتا کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں، اس حدیث مبارکہ کو سامنے رکھیں اور غور کریں کہ اسی لفظ کو امامی عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے گلے کے ہار کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ تو اس کا مذاق اڑانے سے بات کہاں تک پہنچ رہی ہے اس کا جواب یہ حضرات خود سوچیں.....

اصطلاحی تعریف

امام جرجانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

التقليد اتباع الإنسان غيره فيما يقوله أو يفعله معتقداً حقيقته، من غير نظرو تأمل في الدليل كأن المتبع جعل قول الغير أو فعله قلادة في عنقه.

(التعريفات ۱۹۹/۱)

تقلید کسی شخص کی پیروی کو کہتے ہیں اس کے قول یا فعل کے صحیح ہونے کا اعتقاد رکھتے ہوئے بغیر غور و فکر کیے اور بغیر دلیل کی تلاش کے گویا کہ وہ شخص دوسرے کی بات کو اپنے گلے میں ہار کی طرح ڈال لیتا ہے۔

امام جوینی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

التقليد قبول قول الغير وأنت لا تدري من أين يقوله فعلى هذا قبول قول المفتي.

(البرهان في أصول الفقه ۸۸۸/۲)

تقلید کسی بات کو مان لینے کا نام ہے جب کہ ماننے والے کو یہ نہ معلوم ہو کہ کہنے والا کہاں سے بات کر رہا ہے۔ مفتی کی بات کو ماننا اسی قبیل سے ہے۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

هو قبول المقلد بغير حجة فيلزم المقلد ما كان في ذلك القول.

(المسودة ۴۹۴/۱)

تقلید کا مطلب مقلد کا بغیر مطالبہ دلیل بات کو قبول کر لینا ہے تو مقلد کے لیے اس بات کو مان لینا لازم ہو جاتا ہے۔

واضح رہے کہ جہاں بھی تقلید کی تعریف میں 'قبول قول الغير بغير حجة' آتا ہے تو اس سے مراد یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ قول سرے سے ہی بغیر دلیل کے ہے بلکہ مراد یہ ہوتا ہے کہ مقلد اس قول کو بغیر مطالبہ دلیل کے مانتا ہے اور اس کو دلیل کا کچھ علم نہیں ہوتا نہ یہ کہ وہ قول اصلاً ہی بلا دلیل ہوتا ہے۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

لا ينبغي للعامة أن يطالب المفتي بالحجة فيما أفتاه ولا يقول له لم ولا كيف؟ فإن أحب أن تسكن نفسه بسماع الحجة في ذلك سأل عنها في مجلس آخر أوفيه بعد قبوله الفتوى مجردة عن الحجة.

(المسودة ۴۹۴/۱)

عام آدمی کے لیے مناسب نہیں کہ مفتی سے فتویٰ لینے کے بعد دلیل کا مطالبہ کرے اور یہ کہے کہ ایسا کیوں ہے اور ایسا کیوں نہیں؟ اگر وہ دلیل

معلوم کر کے اپنے دل کو اطمینان دینا چاہتا ہو تو بعد میں پوچھ لے یا اسی مجلس میں بغیر دلیل کے فتویٰ کو مان لینے کے بعد پوچھ لے۔

مذکورہ بالا تمام تعریفات سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ تقلید کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی کسی اہل علم، جس کی امانت و تقویٰ پر اسے اعتماد ہو، کی بات کو بلا مطالبہ دلیل تسلیم کر لے اور اس کے فتویٰ کے مطابق اپنے دینی اعمال بجالائے اور یہ اعتقاد رکھے کہ یہ عالم دین مآخذ شریعت کی روشنی میں بات کرتا ہے اور انہی مآخذ کے مطابق اس نے مجھے بھی مسئلہ بتلایا ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ مستقل بالذات اطاعت تو محض اللہ تبارک و تعالیٰ اور اس کے احکام کی روشنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ہے اور ان دو ہستیوں کے علاوہ کسی کو بھی یہ مقام حاصل نہیں کہ اس کی اطاعت اس معنی میں کی جائے کہ اس کا کلام شرعی مآخذ میں سے ایک مآخذ ہے۔ بلکہ اگر کسی کی اطاعت کی جاتی ہے تو محض اس لیے کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں فیصلے کرتا ہے تو گویا اس کی اطاعت اصالتاً نہیں بلکہ تبعاً ہے۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

إنما يجب على الناس طاعة الله ورسوله وهؤلاء أولو الأمر الذين أمر الله بطاعتهم في قوله أطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولى الأمر منكم إنما تجب طاعتهم تبعاً لطاعة الله ورسوله لا استقلالاً.

(الفتاوى الكبرى ۲۰/۲۰۸)

لوگوں پر اصل میں تو اللہ اور رسول کی اطاعت ہی واجب ہے اور یہ اولوالامر جن کی اطاعت کا اللہ نے اس قول میں حکم دیا ہے، اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول واولی الامر منکم، تو ان اولوالامر کی اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے تحت واجب ہے نہ کہ مستقلاً۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں نہ براہ راست خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کی جائے۔ درمیان میں کسی اور کا واسطہ دینا کیا اتنا ضروری ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں؟

اس سوال کا جواب کچھ تفصیل کا متقاضی ہے۔ وہ یہ کہ شرعی احکام کی کئی قسمیں ہیں بعض احکام تو ایسے ہیں کہ ان کے مطالب و مفاہیم میں کسی قسم کا ابہام نہیں پایا جاتا وہ اپنے مدلول پر بالکل وضاحت اور قطعیت کے ساتھ دلالت کرتے ہیں مثلاً اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ

(البقرة ۲ : ۱۸۳)

اے ایمان والو تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں۔

اور آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے

الكبائر الإِشْرَاقُ بِاللَّهِ وَ عَقْوُقُ الْوَالِدِينَ وَ قَتْلُ النَّفْسِ وَ الْيَمِينَ الْغَمُوسُ .

(صحيح البخارى باب اليمين الغموس)

بڑے گناہ یہ ہیں: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، کسی جان کو قتل کرنا اور جھوٹی قسم کھانا۔

یہ دونوں ارشادات ایسے ہیں کہ ان کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے کسی قسم کی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ آیت کریمہ روزوں کی فرضیت کو بتلا رہی ہے اور حدیث شریف میں چند کبیرہ گناہوں کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ مفہوم بالکل ظاہری الفاظ سے ہی مترشح ہو رہا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ بعض ارشادات ایسے ہیں کہ ان کے مفہوم میں کسی قسم کا ابہام پایا جاتا ہے۔ یہ ابہام مختلف طرح کا ہو سکتا ہے مثلاً کسی آیت یا حدیث میں کوئی ایسا لفظ استعمال ہوا ہو جو کثیر المعنی ہو اور وہ تمام معانی مختلف مفہیم و مطالب پر دلالت کرتے ہوں اور عربی زبان کے قواعد کی رو سے وہ تمام معانی مراد لینا درست بھی ہو۔ اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی معنی کو مراد لیا جائے؟

مثلاً قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ

(البقرة ۲: ۲۲۸)

مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین 'قروء' تک روکے رکھیں۔

'قروء' کا لفظ دو معانی کے لیے آتا ہے، 'طہر' اور 'حیض'۔ دونوں معانی میں سے جس معنی کو بھی مراد لیا جائے وہ دوسرے معنی سے بالکل مختلف مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔ طہر مراد لینے کی صورت میں تین مرتبہ پاکی کا زمانہ گزرنے کے بعد مدت تمام ہوگی جبکہ حیض مراد لینے کی صورت میں تین ماہ واریاں عدت قرار پائیں گی اور دونوں صورتیں ایک دوسری سے بالکل مختلف ہیں۔ اب ایک عام آدمی کس معنی کو لے اور کس کو ترک کرے اور کس بنیاد پر ایسا کرے؟ ظاہر ہے کہ یہ اسکے لیے ممکن نہیں۔

اسی طرح بعض ارشادات ایسے ہیں کہ بظاہر ان کے معارض دوسرے ارشادات موجود ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں دو جگہ ایسی عورتوں کی عدت کا زمانہ بیان کیا گیا ہے جن کے خاوند وفات پا جائیں۔ پہلی جگہ یہ مدت چار ماہ دس دن بیان کی گئی ہے۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا

(البقرة ۲: ۲۳۴)

تم میں سے جو لوگ اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ کر مر جائیں تو وہ بیویاں اپنے آپ کو چار ماہ دس دن تک روکے رکھیں۔

چند آیات کے بعد ارشاد ہوتا ہے

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لَّأَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرِ إِخْرَاجٍ

(البقرة ۲: ۲۴۰)

تم میں سے لوگ اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ کر مر جائیں تو وہ یہ وصیت کر کے جائیں کہ ان بیویوں کو ایک سال تک بغیر گھر سے نکالے نان نفقہ کا حق

ہے۔

اس آیت میں عدت کا زمانہ ایک سال بتایا گیا ہے۔ یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس آیت پر عمل کیا جائے اور کیوں؟

اسی طرح ایک حدیث مبارکہ میں بیماریوں کے متعدی ہونے کی نفی کی گئی ہے۔

لا عدوى ولا طيرة.

(صحیح مسلم باب لا عدوى ولا طيرة)

کوئی بیماری متعدی نہیں ہوتی اور بدشگونی کی کوئی حیثیت نہیں۔

جبکہ ایک دوسری روایت میں جذامی سے اس طرح بچنے کی ہدایت کی گئی ہے جیسے شیر سے بچاؤ کیا جاتا ہے۔

فر من المجذوم فرارک من الأسد.

جذامی (کوڑھی) سے ایسے بھاگو جیسے شیر سے بھاگتے ہو۔

اب دونوں روایات میں سے کس کے مفہوم کو تسلیم کیا جائے اور دوسری روایت کی کیا توجیہ بیان کی جائے؟ ظاہر ہے کہ یہ کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔

پہلی قسم کے ارشادات جو اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل واضح ہیں ان کو چھوڑ کر دوسری اور تیسری طرح کے ارشادات میں یہی صورت قابل عمل ہے کہ علماء میں سے جس پر اعتماد ہو اس کی بات کو مان لیا جائے اور یہ عمل خدا اور اس کے رسول کی اطاعت ہی کہلائے گا نہ کہ اس کے برخلاف اس سے علیحدہ کوئی چیز۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ اسی بات کو اس طرح بیان کرتے ہیں

فطاعة الله ورسوله وتحليل ما أحله الله ورسوله وتحريم ما حرمه الله ورسوله وإيجاب ما أوجبه الله ورسوله واجب على جميع الثقلين، الإنس والجن، واجب على كل أحد في كل حال سرا وعلانية. لكن لما كان من الأحكام مالا يعرفه كثير من الناس رجع الناس في ذلك إلى من يعلمهم ذلك لأنه أعلم بما قال الرسول وأعلم بمراده. فأئمة المسلمين الذين اتبعوهم وسائل وطرق وأدلة بين الناس وبين الرسول يبلغونهم ماقاله ويفهمونهم مراده.

(مجموع الفتاوى ۲/۲۳۹)

پس اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی اطاعت اور انہوں نے جس کو حلال کیا ہے اس کو حلال سمجھنا اور جس کو حرام کیا ہے اسے حرام سمجھنا انسانوں اور جنوں دونوں گروہوں پر واجب ہے، ہر حال میں، ظاہراً بھی اور سراً بھی۔ لیکن چونکہ بہت سے احکام ایسے ہیں جن کو عام لوگ نہیں جانتے اور ان کے جاننے میں وہ ایسے افراد کے محتاج ہیں جو ان احکام سے آگاہ کریں کیونکہ وہ اللہ کے رسول ﷺ کے اقوال اور ان کی مراد سے زیادہ آگاہ ہوتے ہیں۔ پس لوگ جن اماموں کی پیروی کرتے ہیں وہ لوگوں اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان اسباب، راستوں اور دلائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے اقوال لوگوں تک پہنچاتے ہیں اور ان کی مراد سے آگاہ کرتے ہیں۔

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسا شخص جو براہ راست نصوص شرعیہ سے استنباط کی صلاحیت نہیں رکھتا؛ اور اکثریت ایسے افراد کی ہی ہے؛ وہ کسی بڑے عالم کی بات پر اس اعتماد سے عمل کرے کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے قرآن و سنت کی روشنی میں ہی کہہ رہا ہے تو اس عمل کا نام تقلید ہے۔

مشروعیت تقلید

جیسا کہ تقلید کی تعریف میں پیچھے مذکور علماء کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ تقلید کا مطلب ہے کسی ایسے شخص کا جو استنباط احکام کی صلاحیت نہ رکھتا ہو کسی مجتہد سے بغیر مطالبہ دلیل کے مسئلہ دریافت کرنا اور اس مسئلہ کے حق ہونے کا اعتقاد رکھتے ہوئے اس پر عمل کرنا۔ اور تقلید ان معنوں میں شریعت اسلامیہ میں ثابت ہے۔

ذیل میں ہم مختصراً چند دلائل تقلید کی مشروعیت پر پیش کرتے ہیں۔

تقلید کا ثبوت قرآن کریم سے

۱. يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِيَ الْأَمْرِ مِنْكُمْ

(النساء ۴: ۵۹)

اولی الامر کی تفسیر میں حضرت جابر بن عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما، حسن بصری عطاء اور مجاہد رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
إنهم اولوا الفقه والعلم.

(أحكام القرآن للجصاص ۱۷۷/۳)

اولی الامر سے مراد اہل فقہ اور اہل علم ہیں۔

امام ابو بکر جصاص رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

وقوله تعالى عقيب ذلك فإن تنازعتم في شئ فردوه إلى الله والرسول يدل على أن أولى الأمرهم الفقهاء لأنه أمر سائر الناس بطاعتهم ثم قال فإن تنازعتم في شئ فردوه إلى الله والرسول فأمر أولى الأمر برد المتنازع فيه إلى كتاب الله و سنة رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم ... ومن ليس من أهل العلم ليست هذه منزلتهم لأنهم لا يعرفون كيفية الرد إلى كتاب الله والسنة و وجوه دلائلها على احكام الحوادث فثبت أنه خطاب للعلماء.

(المرجع السابق)

اس آیت کے بعد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ، اس بات کی دلیل ہے کہ اولو الامر سے مراد فقہاء ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو ان کی اطاعت کا حکم دیا اور پھر فرمایا کہ اگر تم کسی معاملے میں مختلف فیہ ہو جاؤ تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ، تو اللہ تعالیٰ نے اولو الامر کو متنازع فیہ امور کو اپنی کتاب اور اپنے رسول کی سنت کی طرف لوٹانے کا حکم دیا۔۔۔ اور جو لوگ اہل علم میں سے نہیں یہ ان کا مرتبہ و مقام نہیں کیونکہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف احکام کے لوٹانے کی کیفیت اور ان دونوں کی احکام پر دلالت کے طریقوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ یہ خطاب علماء کے لیے ہے۔

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں

فإن العلماء هم المستنبطون المستخرجون للأحكام.

(روح المعانی ۶۶/۵)

بیشک علماء ہی احکام کا استنباط و استخراج کرنے والے لوگ ہیں۔

اس آیت کریمہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عوام کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے مسائل کے حل کے لیے اہل علم سے رجوع کیا کریں نہ یہ کہ وہ خود اس کام کو سرانجام دینے کی کوشش کریں کیونکہ یہ ان کا فرض منصبی نہیں بلکہ علماء کا فریضہ اور وظیفہ ہے۔

۲. فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ

(النحل ۱۶ : ۴۳؛ الأنبياء ۲۱ : ۷)

اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھ لو۔

اس آیت کریمہ میں بھی عوام کو حکم دیا جا رہا ہے کہ جن مسائل میں انہیں شبہ ہو یا عدم علم کی وجہ سے وہ ان کے حکم سے لاعلم ہوں تو انہیں چاہیے کہ علماء سے رجوع کریں اور ان کی بات پر عمل کریں۔

امام ابو بکر جصاص رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

وكان العلماء عدول مرضيين موثوقا بدینهم وأمانتهم فيما يؤدون وهو نظير قوله تعالى فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم

(أحكام القرآن ۱۷۷/۳)

علماء ہی عادل، مقبول اور دین و امانت کے معاملے میں قابل اعتماد ہوتے ہیں اور جن احکام کو وہ آگے پہنچاتے ہیں (ان احکام کے پہنچانے میں بھی وہ قابل اعتماد ہوتے ہیں)۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھ لو کی نظیر ہے۔

امام بیضاوی رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں

وفي الآية دليل على وجوب المراجعة إلى العلماء فيما لا يعلم.

(تفسير البيضاوي ۳۹۹/۳)

اس آیت میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ جن معاملات کا علم نہیں ہوتا ان میں علماء کی طرف مراجعت کی جائے۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام جلال الدین محلی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول نقل کرتے ہیں

يلزم غير المجتهد عاميا كان او غيره التقليد للمجتهد لقوله تعالى فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون.

(روح المعاني ۱۲۸/۱۲)

غیر مجتہد خواہ عامی ہو یا کوئی اور، اس پر مجتہد کی تقلید لازمی ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی بنا پر اہل علم سے دریافت کر لیا کرو اگر تم نہیں جانتے۔

۳. فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ

(التوبة ۹: ۱۲۲)

مسلمانوں کے ہر گروہ میں سے کوئی جماعت کیوں نہیں نکلتی، تاکہ وہ دین میں سمجھ بوجھ حاصل کریں اور اپنی قوم میں واپس آ کر ان کو ڈرائیں تاکہ وہ گناہوں سے کنارہ کریں۔

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں

فيه اشارة الى انه يجب على كل مستعد من جماعة سبوك طريق طلب العلم اذ لا يكن بجمعهم اما ظاهراً فلفوات المصالح واما باطنا فلعدم استعداد الجميع.

(روح المعاني ۵۶/۱۱)

اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ صاحب استعداد لوگوں پر ہی علم کی طلب کرنا لازم ہے کیونکہ سب لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔ ظاہری طور پر اس کے لیے کہ اس سے مصالح عامہ میں خلل پڑے گا اور باطناً اس لیے کہ سب میں مطلوبہ استعداد نہیں ہوتی۔ مذکورہ آیات سے یہ بات مبرہن ہوتی ہے کہ غیر مجتہد کے لیے مجتہد کی تقلید کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

تقلید کا ثبوت احادیث نبویہ سے

۱۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ہم ایک مرتبہ سفر میں تھے۔ اثنائے سفر میں ایک ہمراہی کو پتھر لگنے سے سر میں زخم

ہو گیا۔ رات کو اُسے غسل کی حاجت ہو گئی۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا

هل تجدون لي رخصة في التيمم؟

کیا تم میرے لیے تیمم کرنے کی رخصت پاتے ہو؟

اُنہوں نے جواب دیا

مانجد لك رخصة وانت تقدر على الماء.

توپانی پر قادر ہے، ہم تیرے لیے کوئی رخصت نہیں پاتے۔

اس نے غسل کیا اور مر گیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا

قتلوه قتلهم الله الا سالوا اذ لم يعلموا فانما شفاء العي السؤال.

(سنن البيهقي الكبرى باب إذا كان الجرح في بعض جسده دون بعض)

انہوں نے اس کو قتل کر ڈالا، اللہ ان کو قتل کرے، ان کو معلوم نہیں تھا تو پوچھا کیوں نہیں؟ بے شک کجی کا علاج پوچھ لینے میں ہے۔

اس حدیث مبارکہ میں اسی بات کی طرف راہنمائی کی گئی ہے جس کا بیان گزر چکا ہے کہ عامی کے لیے جائز نہیں کہ وہ خود مسائل کی تحقیق اور احکام کے استنباط میں مصروف ہونے کی کوشش کرے بلکہ اس کے ذمہ ضروری ہے کہ اہل علم سے رابطہ کر لے اور جیسا وہ کہیں عمل کرے اور اپنی فہم پر ان کی فہم کو ترجیح دے۔

۲۔ تقلید کا واضح ترین ثبوت حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی روایت سے ہوتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ان کو یمن روانہ فرمایا اور ان سے پوچھا

كيف تقضى ان عرض لك القضاء؟ قال اقضى بكتاب الله. قال فان لم تجد في كتاب الله؟ قال فبسنة رسول الله صلى الله عليه واله وسلم. قال فان لم تجد في سنة رسول الله صلى الله عليه واله وسلم ولا في كتاب الله؟ قال اجتهد رأيي ولا آلو.

(سنن أبي داود باب اجتهاد الرأى فى القضاء)

جب تیرے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہو تو فیصلہ کیسے کرے گا؟ کہا: میں کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا۔ فرمایا: اگر کتاب اللہ میں نہ ملے تو؟ کہا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی سنت سے۔ فرمایا: اگر کتاب اللہ اور سنت دونوں میں نہ ملے تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی: میں اپنے رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوئی کوتاہی نہ کروں گا۔

اس مکالمے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے خوش ہو کر حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا

الحمد لله الذى وفق رسول الله صلى الله عليه واله وسلم لما يرضى رسول الله.

(المرجع السابق)

اس اللہ کا شکر ہے جس نے اللہ کے رسول کے فرستادہ کو اس بات کی توفیق بخشی جس سے اللہ کا رسول راضی ہے۔

اب ظاہر ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو اجتہاد فرماتے تھے اور یمن کے لوگ ان کے اجتہادات کی پیروی پر مامور تھے۔ یہ تقلید نہیں تو اور کیا ہے۔

۳۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا

ان الله لا يقبض العلم انتزاعا ينتزعه من الناس ولكن يقبض العلم بقبض العلماء حتى اذا لم يبق عالم اتخذ الناس رؤسا جهالا فاستلوا فافتوا بغير علم فضلوا وأضلوا.

(مصنف ابن أبي شيبة ابواب أشرط الساعة)

اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں سے چھین کر نہیں اٹھائے گا بلکہ وہ علم کو علماء کے اٹھانے سے اٹھا لے گا سوائے ان کے کہ کوئی عالم بھی باقی نہ رہے گا تو لوگ جاہل و

سردار بنالیں گے اور ان سے مسائل دریافت کریں گے تو وہ بغیر علم کے فتویٰ دے کر خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ اس حدیث مبارکہ میں اس بات کی صراحت ہے کہ فتویٰ دینا، مسئلہ بتانا صرف علماء کا کام ہے عام آدمی کو ہرگز اجازت نہیں کہ وہ فتویٰ دیتا پھرے کیونکہ اس سے گمراہی کے دروازے کھلتے ہیں۔ دوسری بات جو اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ جب تک علمائے اہل اجتہاد موجود ہوں اس وقت تک ان سے مسائل معلوم کیے جائیں اور ان کے فتوؤں پر عمل کیا جائے اور جب کوئی عالم باقی نہ رہے تو نااہل لوگوں کو مجتہد سمجھ کر ان کے فتوؤں پر عمل کرنے کے بجائے گزشتہ علماء میں سے کسی کی تقلید کی جائے۔ بطور مثال ہم نے تین احادیث ذکر کی ہیں وگرنہ اس موضوع پر مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے کہ بے شمار احادیث سے تقلید کا نہ صرف جواز بلکہ لزوم معلوم ہوتا ہے۔

آثار صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ثبوت تقلید

عہد صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں مسئلہ تقلید زیادہ کھل کر سامنے آیا۔ ایسے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جو فقیہ نہ تھے اور علم و تعلم میں مصروف نہ تھے وہ اور تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ فقیہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مسائل دریافت کیا کرتے تھے اور بغیر مطالبہ دلیل کے ان پر عمل کیا کرتے تھے۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں

۱۔ حضرت حارثہ بن مضرب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کوفہ بھیجا تو اہل کوفہ کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا۔

انی قد بعثت عماراً امیراً و عبد اللہ بن مسعود معلماً و وزیراً و هما من النجباء من اصحاب محمد صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم من اہل بدر واحد فاقتموا بہما و اسمعوا من قولہما و قد اثرکم بعد اللہ علی نفسی۔

(المستدرک علی الصحیحین باب مناقب عمار بن یاسر رقم ۵۶۸۴ ؛ معرفة الصحابة باب المیم من باب العین

رقم ۳۹۹۶)

میں نے عمار بن یاسر کو تمہارا امیر اور عبداللہ بن مسعود کو استاد بنا کر بھیجا ہے۔ یہ دونوں اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چنیدہ اور اہل بدر و احد میں سے ہیں تم ان دونوں کی پیروی کرو اور ان کی باتوں کو دھیان سے سُنو۔ اور میں نے عبداللہ بن مسعود کے معاملے میں تمہیں اپنے اوپر ترجیح دی ہے۔

اس خط کے ذریعے حضرت عمرؓ نے اہل کوفہ پر لازم قرار دیا کہ وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اقتداء کریں اور ان کے اقوال پر عمل پیرا ہوں اور اسی کا نام تقلید ہے۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے

خطب عمر بن الخطاب بالجابية فقال يا أيها الناس من أراد أن يسأل عن القرآن فليأت أبي بن كعب و من أراد أن

يسأل عن الفقه فليأت معاذ بن جبل۔

(المعجم الأوسط رقم ۳۷۸۳)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جابہ نامی جگہ میں خطبہ دیا اور فرمایا اے لوگو جو قرآن کریم سے متعلق پوچھنا چاہے وہ ابی بن کعب کے پاس جائے اور جو میراث کے مسائل دریافت کرنا چاہے وہ زید بن ثابت کے پاس آئے اور جو فقہی مسائل پوچھنا چاہے وہ معاذ بن جبل کے پاس جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ جس معاملے میں مسئلہ درپیش ہو وہ معاملہ اس کے ماہر کے سامنے پیش کیا جائے اور اس کے قول کے مطابق عمل کیا جائے۔ خود براہ راست نصوص سے استنباط احکام کی کوشش نہ کی جائے۔ تقلید کی تعریف میں یہ بات گزر چکی ہے کہ غیر مجتہد کسی مجتہد کی بات کو مان کر بغیر مطالبہ دلیل کے اس کے مطابق عمل کر لے اسی کا نام تقلید ہے۔ حضرت عمرؓ کے فرمان کی حقیقت بھی یہی ہے۔ بات کی وضاحت کے لیے یہ دو مثالیں کافی ودانی ہیں۔

مذاهب اربعہ کی تقلید کا لزوم

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات تو مان لی کہ عامی کے لیے یہ لازم ہے کہ کسی عالم کی تقلید کرے تو پھر مذاہب اربعہ کی تخصیص کی کیا ضرورت ہے، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں جو فقہاء صحابہ تھے یا تابعین رحمہم اللہ میں جو فقہاء تھے کیوں نہ ان کی تقلید کی جائے؟ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ اس سوال کے جواب میں فرماتے ہیں

فمالک واللیث بن سعد والا وزاعی والثوری هؤلاء ائمة فی زمانہم و تقلید کل منہم کتقلید الاخر لا یقول مسلم انه یجوز تقلید هذا دون هذا ولكن من منع تقلید احد هؤلاء فی زماننا فانما یمنعه لأحد الشیئین. احدهما اعتقاده انه لم یبق من یعرف مذاہبہم و تقلید المیت فیہ خلاف مشہور . . . ومن سو غه قال لا بد ان یکون فی الایاء من یعرف قول المیت.

(الفتاویٰ الکبریٰ ۴/۲۶۱)

امام مالک، لیث بن سعد، اوزاعی اور ثوری رحمہم اللہ تعالیٰ سب اپنے زمانوں کے امام تھے اور ان میں سے ہر ایک کی تقلید دوسرے کی تقلید کی طرح ہے اور کوئی مسلمان یہ نہیں کہتا کہ اس کی تقلید جائز ہے اور اس کی نہیں۔ آج کل جو ان کی تقلید سے روکتا ہے وہ دو وجہوں میں سے ایک کی وجہ سے روکتا ہے۔ پہلی یہ کہ وہ سمجھتا ہے کہ اب ان کے مذاہب کو جاننے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ اور مردہ کی تقلید میں اختلاف مشہور ہے۔۔۔ اسے جائز قرار دینے والوں کا کہنا ہے کہ اگر زندوں میں سے کوئی ایسا ہو جو مردہ کے اقوال کو جانتا ہو تو تقلید جائز ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کسی عامی کے لیے جائز نہیں کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے کسی کو اپنا امام بنا کر اس کی تقلید شروع کر دے۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے امام نووی لکھتے ہیں

لأنہم لم یتفرغوا لتدوین العلم و ضبط أصوله و فروعه فلیس لأحد منہم مذهب محدد مقرر وانما قام بذلك من جاء بعدہم من الأئمة . . . کمالک و ابی حنیفہ.

(المجموع شرح المہذب ۹/۱)

کیونکہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے علم کی تدوین اور اس کے اصول و فروع کے ضبط کا التزام نہیں کیا اس لیے ان میں سے کسی کا مذہب، منقح، تحریر شدہ اور ثابت شدہ نہیں۔ یہ کام ان کے بعد میں آنے والوں نے کیا۔۔۔ جیسے مالک اور ابو حنیفہ رحمہما اللہ تعالیٰ۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے مذاہب اربعہ کی تقلید کے لزوم اور ان سے خروج کو مذموم قرار دیتے ہوئے اس کی کئی وجوہات بیان کی ہیں جن میں سے اہم یہ ہیں۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں

احدها ان الامة اجتمعت على ان يعتمدوا على السلف في معرفة الشريعة فالتابعون اعتمدوا على الصحابة واتباع التابعين اعتمدوا على التابعين وهكذا في كل طبقة والعقل يدل على حسن ذلك.

(عقد الجيد في أحكام الاجتهاد والتقليد ۱۳/۱)

پہلی وجہ یہ کہ امت نے متفقہ طور پر سلف سے شریعت کی تفہیم کی ہے۔ تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر اعتماد کیا اور تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ نے تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ پر اعتماد کیا اسی طرح ہر طبقہ میں ہوا اور عقل بھی اس کو اچھا جانتی ہے۔

آگے چل کر شاہ صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ نے سلف کے مسلک پر عمل کرنے کی کچھ شرائط بیان کی ہیں مثلاً ان کے اقوال ہم تک صحیح سند سے پہنچے ہوں اور بعد کے علماء نے ان اقوال کو واضح کیا ہو اور ان کے دلائل اور علتوں کو ظاہر کیا ہو۔

اس کے بعد فرماتے ہیں

وليس مذهب في هذه الازمنة المتاخرة بهذا الصفة الا هذه المذاهب الاربعة .

(المرجع السابق)

اس بعد والے زمانے میں ان صفات کا حامل مذہب سوائے ان مذاہب اربعہ کے کوئی نہیں۔

دوسری وجہ کا ذکر کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں

وثانيها قال رسول الله صلى الله عليه واله وسلم اتبعوا السواد الأعظم ولما اندرست هذه الأربعة كان اتباعها اتباعا للسواد الأعظم والخروج عنها خروجا عن السواد الأعظم.

(المرجع السابق)

دوسری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا 'سوادِ اعظم کی پیروی کرو'۔ اور جب یہ مذاہب اربعہ مروج ہو گئے تو ان کی اتباع سوادِ اعظم کی اتباع ہے اور ان سے خروج سوادِ اعظم سے خروج کے مترادف ہے۔

صاحب التقریر و التخییر نے امام رازی رحمہم اللہ تعالیٰ کے حوالے سے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی تقلید کے عوام کے لیے ناجائز ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔

وقد نقل الإمام الرازي اجماع المحققين على منع العوام من تقليد أعيان الصحابة . . . قال بل عليهم أن يتبعوا مذاهب الأئمة.

(التقريب والتجسير ۴۷۲/۳)

امام رازی نے محققین کا اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ عوام کو کسی متعین صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تقلید سے روکنا چاہیے۔۔۔ امام رازی نے فرمایا ہے بجائے اس کے انہیں چاہیے کہ ائمہ کے مذاہب کی پیروی کریں۔

ابن تیمیہ رحمہم اللہ تعالیٰ ایک اور جگہ لکھتے ہیں

وليس له التمذهب بمذهب احد ائمة الصحابة وان كانوا أعلم لأنهم لم يتفرغوا لتدوين العلم وضبط اصوله و فروعه فليس لأحد منهم مذهب.

(المسودة ۴۱۴/۱)

کسی کے لیے جائز نہیں کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے کسی کے مذہب کی پیروی کرے حالانکہ ان کا علمی مقام زیادہ بلند ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے علم کی تدوین اور اس کے اصول و فروع کے ضبط کا اہتمام نہیں کیا اسی وجہ سے ان میں سے کسی کا مذہب نہیں ہے۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں کہ ابن قدامہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے مذاہب اربعہ کے علاوہ کسی مذہب کی تقلید کے لیے لازمی قرار دیا ہے کہ وہ مدون و مرتب مشکل میں موجود ہو۔

انه شرط في تقليد الغير أن يكون مذهبه مدوناً محفوظاً بالشروط والمعتبرات.

(روح المعاني ۱۴۸/۱۴)

ائمہ اربعہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی تقلید کے جائز ہونے کی شرط یہ ہے کہ اس کا مذہب اپنی جملہ شروط و اعتبارات کے لحاظ سے مدون ہو۔ علامہ سبکی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

إن مخالف الأربعة كمخالف الأجماع.

(المرجع السابق)

ائمہ اربعہ رحمہم اللہ تعالیٰ کی مخالفت اجماع کی مخالفت کی طرح ہے۔

متذکرہ بالا حوالہ جات سے ثابت ہوتا ہے کہ اب تقلید ہوگی تو صرف ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی۔ ان کے علاوہ کسی کی تقلید جائز نہیں۔ تنوینی طور پر ان مذاہب کی تقلید کو باقی رکھا گیا اور باقی کے مذاہب وقت کے ساتھ ختم ہو گئے۔

مذاہب واحد کی تقلید کی حیثیت

متذکرہ بالا بیان سے اس بات کا ثبوت تو ہو گیا کہ تقلید قرآن، حدیث، آثار صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور اجماع امت کی رو سے نہ صرف جائز بلکہ غیر مجتہد کے لیے ضروری ہے۔ اور غیر مجتہد کے لیے اصلاً درست ہے کہ جس مجتہد پر اسے اعتماد ہو اس کے مذہب پر عمل کرے۔ اسی طرح عامی کے لیے بھی جائز ہے کہ جس عالم پر اسے اعتماد ہو اس سے پوچھ پوچھ کر مسائل پر عمل کرے اور اس کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ جب چاہے کسی بھی عالم سے مسئلہ دریافت کرے ہمیشہ کسی ایک ہی عالم سے رجوع اس کے لیے لازمی نہیں۔ لیکن یہ اطلاق اپنے اطلاق پر جاری نہیں بلکہ کچھ حدود کا پابند ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر ہر شخص کو اس بات کی کھلی اجازت دے دی جائے کہ وہ جس عالم سے چاہے مسئلہ دریافت کر کے اس پر عمل کرے تو اسکے نتیجے میں ہوی پرستی کا دروازہ کھل جائے گا۔

عہد صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور دور تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ میں دیانت عام تھی۔ خیر القرون ہونے کی وجہ سے لوگوں میں دینی شعور اور دینی احکام کی اصل اغراض و مقاصد ابھی زندہ تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ دینی احتیاط اور تقویٰ و دیانت کم ہوتی جا رہی تھی۔ اسی بنا پر علمائے سلف نے یہ لازم کر دیا کہ ایک وقت میں کسی ایک عالم کی اتباع ہی لازمی ہے۔

اس کی وجہ علماء امت نے بیان کرتے ہوئے لکھا کہ انسان فطری طور پر کمزور اور اپنی خواہشات سے مغلوب ہو جانے والا ہے اگر اس کو کھلی چھٹی دے دی جائے تو وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی خواہشات کے مطابق مسائل پر عمل کیا کرے گا۔

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ عہد صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور دور تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ میں تو اس کو لازمی قرار نہیں دیا گیا پھر آج کے دور میں اس کی پابندی کیوں ضروری ہے؟

امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ ان دونوں اعتراضات کے جواب میں فرماتے ہیں

لوجاز اتباع أى مذهب شاء لأفضى إلى ان يلتقط رخص المذاهب متبعا هواه ويتخير بين التحليل والتحرير والوجوب والجواز. وذلك يودى الى انحلال ربة التكليف بخلاف العصر الأول فإنه لم تكن المذاهب الوافية بأحكام الحوادث مهذبة فعلى هذا يلزمه ان يجتهد فى اختيار مذهب يقلده على التعيين.

(المجموع شرح المذهب ٩١/١)

اگر حسب خواہش ہر مذہب کی اتباع کو جائز قرار دیا جائے تو اس کا نتیجہ اپنی خواہشات کے تحت مختلف مذاہب سے رخصتیں تلاش کرنے اور حلال و حرام اور وجوب و جواز کے درمیان تخییر کی صورت میں نکلے گا۔ اور یہ چیز شرعی احکام کی پابندیوں کی گرہ کھول کر رکھ دے گی، پہلے زمانہ کے برخلاف کیونکہ اس دور میں مذاہب نئے نئے احکام کے سلسلے میں منہج اور مہذب نہیں تھے۔ اس بنا پر لازمی ہے کہ کسی متعین مذہب کی تقلید کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے۔

تقلید کے مختلف درجات

تقلید کے مسئلہ میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں ان کی ایک بڑی وجہ یہ ہے تقلید کے درجات کا لحاظ نہیں کیا جاتا اگر تقلید کے مختلف مدارج کو پیش نظر رکھا جائے تو بہت سی غلط فہمیوں سے نجات مل جاتی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے تقلید کے چار درجات قرار دیئے ہیں۔

فرماتے ہیں

إعلم أن الناس في الأخذ بهذه المذاهب الأربعة على أربعة منازل و لكل قوم حد لا يجوز ان يتعدوه . أحدها مرتبة المجتهد المطلق المنتسب إلى صاحب مذهب من تلك المذاهب الأربعة وثانيها مرتبة المخرج وهو المجتهد في المذهب وثالثها مرتبة المتبحر في المذهب الذي حفظ المذهب و اتقنه ورابعها المقلد الصرف .

(عقد الجيد في أحكام الاجتهاد والتقليد ١/١٤٧)

جان لو کہ ان مذاہب اربعہ کے ماننے میں لوگوں کے چار درجات ہیں اور ہر گروہ کی ایک حد ہے جس سے آگے بڑھنا اس کے لیے درست نہیں۔ پہلا درجہ ان مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک کے بانی کی طرف منتسب مجتہد کا ہے اور دوسرا درجہ صاحب تخریج کا ہے اور اسے مجتہد فی المذہب بھی کہتے ہیں۔ اور تیسرا درجہ ثقہ عالم کا ہے جو مذہب کا حافظ اور متیقن ہو۔۔۔ اور چوتھا درجہ محض مقلد کا درجہ ہے۔

ہم آئندہ صفحات میں مختلف درجات کے اصحاب کی تقلید پر مختصر بحث کریں گے اور ان کی حدود کا جائزہ لیں گے کہ وہ تقلید کے کس درجے کے مکلف ہیں۔ ان درجات میں مذکورہ بالا چار درجات سے تھوڑا بہت فرق ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

1- مجتہد مطلق کی تقلید

اصحابِ مذاہبِ اربعہ اگرچہ سب کے سب مجتہد مطلق تھے مگر وہ بھی ان مسائل میں جن میں کوئی نص موجود نہیں ہوتی تھی بجائے اپنی رائے دینے کے صحابہؓ سے منقول اقوال میں سے کسی کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں:

آخذ بكتاب الله فان لم أجد فبسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم فان لم أجد فى كتاب الله و سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم آخذ بقول الصحابة ثم آخذ بقول من شئت منهم وأدع قول من شئت منهم ولا أخرج عن قولهم .

میں کتاب اللہ سے مسائل لیتا ہوں اگر وہاں نہ ملیں تو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اور اگر ان دونوں میں نہ ملیں تو صحابہؓ سے جس کے قول کو چاہتا ہوں اختیار کر لیتا ہوں اور ان کے اقوال سے باہر نہیں نکلتا۔

اور یہ صرف ائمہ اربعہ پر موقوف نہیں بلکہ صحابہؓ سے جو مجتہد مطلق صحابہؓ تھے وہ بھی اپنے سے علم صحابہؓ کی تقلید کیا کرتے تھے۔ اگر ان کا کوئی قول نہ ملتا تھا تو پھر اجتہاد کیا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن ابی یزیدؒ حضرت ابن عباسؓ کا طریق افتاء واجتہاد نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

كان ابن عباس إذا سئل عن الأمر فكان في القرآن أخبر به وإن لم يكن في القرآن وكان عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أخبر به فإن لم يكن فعن أبو بكر وعمر فإن لم يكن فقال فيه برأيه.

(سنن الدارمی باب الفتی و ما فیہ من شدۃ)

ابن عباسؓ سے جب کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو اگر وہ کتاب اللہ میں ہوتا تو وہاں سے بتا دیتے اور اگر کتاب اللہ میں نہ ہوتا تو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بتا دیتے۔ اگر وہاں بھی نہ ہوتا تو حضرت ابوبکر و عمرؓ سے نقل کرتے۔ اگر ان دونوں حضرات کا قول بھی نہ ملتا تو پھر اپنی رائے دیتے۔

2- مجتہد فی المذہب کی تقلید

مجتہد فی المذہب فقیہ اصول میں اپنے امام کا مقلد ہوتا ہے لیکن ان اصول پر متفرع فروع کے لحاظ سے مجتہد ہوتا ہے۔ یہ حضرات ان اصولوں کی روشنی میں براہ راست قرآن و سنت سے استنباط احکام کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ ان کے وظیفہ کے متعلق رقم طراز ہیں۔

إن الواجب على المجتهد في المذهب أن يحصل من السنن والآثار ما يحترز به من مخالفة الحديث الصحيح واتفاق السلف و من دلائل الفقه ما يقدر به على معرفة ما أخذ أصحابه في أقوالهم.

(عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید ۱/۷۱)

مجتہد فی المذہب کے ذمے ضروری ہے کہ وہ سنن اور آثار کو جمع کرے تاکہ ان کے ذریعے صحیح حدیث کی مخالفت سے بچ سکے۔ اس کے علاوہ سلف کے اجماع اور دلائل فقہ کی اتنی مہارت حاصل کرے جس کے ذریعے اپنے اصحاب مذاہب کے اقوال کے مآخذ کی پہچان حاصل کر سکے۔

3- ثقہ عالم کی تقلید:

شاہ ولی اللہ ثقہ عالم کی شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

”من شرطه ان يكون صحيح الفهم عارفا بالعربية وأساليب الكلام و مراتب ترجيح متفطنا لمعاني كلامهم.

(عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید ۲/۱۱)

ثقہ عالم کی شرائط یہ ہیں کہ وہ صحیح فہم کا مالک ہو، عربی زبان جانتا ہو اور کلام کے جملہ اسالیب، مراتب ترجیح متفطناً لمعانی کلامہم کی سمجھ بوجھ رکھتا ہو۔

ثقہ عالم کے لیے بھی ضروری ہے کہ حتی المقدور اپنے امام کے مذہب سے باہر نہ نکلے اور اپنے مذہب کے اقوال میں سے مرجوح اقوال پر حتی الامکان فتویٰ نہ دے کیونکہ وہ بذات خود شروط اجتہاد کا جامع نہ ہونے کی بنا پر مقلد ہی ہے۔ ہاں البتہ خاص حالات میں وہ اپنے امام کے قول کو چھوڑ کر کسی دوسرے امام کے قول پر فتویٰ دے سکتا ہے یا اپنے مذہب کے کسی مرجوح قول پر فتویٰ دے سکتا ہے۔ مگر اس کے لیے خاص شرائط ہیں جن کا یہاں ذکر کرنا

طوالت سے خالی نہ ہوگا، اس لیے ہم اس بحث کو ان شاء اللہ پھر کبھی سمیٹیں گے۔

شاہ ولی اللہؒ نے اس عنوان کے تحت ایک مسئلہ یہ بھی چھیڑا ہے کہ اگر کسی ثقہ عالم کو کوئی ایسی حدیث ملے جو بظاہر اس کے امام کے مسلک کے خلاف ہو تو وہ کیا کرے۔

مسألة إذا وجد المتبحر في المذهب حديثا صحيحا مخالف مذهب فهل له أن يأخذ بالحديث و يترك مذهبه في تلك المسألة .

(عقد الجيد في أحكام الاجتهاد والتقليد ۲۱/۱)

جب کسی ثقہ عالم کو ایسی حدیث ملے جو اس کے مذہب کے مخالف ہو تو کیا اس کے لیے جائز ہے کہ وہ حدیث پر عمل کرے اور اس مسئلہ میں اپنے مذہب کو چھوڑ دے؟

اس کے بعد شاہ صاحب نے تین مسالک نقل کیے ہیں پہلا تو یہ کہ اس کے ذمہ لازمی ہے کہ حدیث پر عمل کرے اور اپنے مسلک کو چھوڑ دے۔ دوسرا مسلک یہ ہے

إنه إذا لم يجمع آلات الاجتهاد لا يجوز له العمل على الحديث بخلاف مذهبه لأنه لا يدري أنه منسوخ أو مؤول أو المحكم محمول على ظاهره و مال إلى هذا القول ابن الحاجب .

(المرجع السابق)

اگر وہ تمام اجتہاد شرائط کا جامع نہ ہو تو اس کے لیے اپنے مذہب کے خلاف حدیث پر عمل کرنا جائز نہیں کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ حدیث منسوخ، مؤول یا ایسی محکم ہو جو اپنے ظاہر پر محمول ہو۔ یہ قول ابن الحاجب نے اختیار کیا ہے۔

اور تیسرا مسلک جسے شاہ صاحب نے پسند کیا ہے یہ ہے کہ ثقہ عالم چند شرائط کے تحت اپنے مسلک کو حدیث کی وجہ سے چھوڑ سکتا ہے۔ ان شرائط کو ابن صلاح شافعی نے ذکر کیا ہے۔

۱. کملت له آلة الاجتهاد مطلقا أو في ذلك الباب .

وہ اجتہاد کے جملہ لوازمات سے یا تو مطلقاً آگاہ ہو یا کم از کم اس مسئلہ میں۔

۲. بعد أن يبحث فلم يجد لمخالفة الحديث جو ابا شافيا عنه .

خوب تحقیق کے بعد وہ اس حدیث کی مخالفت کا کوئی مطمئن کر دینے والا جواب نہ پاسکے۔

یعنی ممکن ہے کہ اس کے امام کے نزدیک وہ حدیث کسی اور معنی پر محمول ہو یا اطلاق و تقلید میں اختلاف ہو یا یہ بھی ممکن ہے کہ امام کے سامنے کوئی دوسری حدیث جو اس حدیث کے معارض ہو موجود ہو اور اس مقلد کے سامنے وہ دوسری حدیث موجود نہ ہو۔

۳. أن كان عمل به إمام مستقل .

(عقد الجيد في أحكام الاجتهاد والتقليد ۳۰/۱ فتاویٰ ابن الصلاح ۴۵/۱)

اس حدیث پر کسی دوسرے مستقل امام نے عمل بھی کیا ہو۔

ان شرائط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے مسلک پر عمل پیرا رہنا کس قدر لازمی ہے اور اس کے خلاف کرنے میں کس قدر قیود حائل ہیں۔ اس سے مراد معاذ اللہ حدیث کا ثانوی چیز ہونا نہیں بلکہ سلف کے علم پر اعتماد اور بعد والوں کے مبلغ علمی کا قصور ہے۔

4- عامی کی تقلید

شاہ ولی اللہ عامی کے بارے میں فرماتے ہیں

إعلم أن العامی الصرف إنما مذهبه مذهب مفتہ.

(عقد الجید فی أحكام الاجتهاد والتقلید ۱/۳۰)

عامی کا مذہب اس کے مفتی کا مذہب ہی ہوتا ہے۔

تاہم اس کو یہ اجازت ہرگز نہیں کہ مختلف مفتیوں سے مسئلہ پوچھ کر اپنی پسند کے جواب کو اختیار کر لے بلکہ کسی ایک مسلک کے مفتی سے ہمیشہ استفتاء کرے اور اسی کے مطابق عمل کرے ورنہ یہ وہی خواہش پرستی کہلائے گی جس کا اجماعی طور پر ممنوع ہونا پیچھے گزر چکا ہے۔

ہاں اگر وہ دوسرے مسلک کو اختیار کرنا چاہتا ہے تو مکمل طور پر اختیار کرے کیونکہ تمام ائمہ برحق اور عند اللہ ماجور ہیں مگر ان کے اقوال معلوم کر کے ان میں رھتیں تلاش کرنا قطعاً جائز نہیں۔

(فتاویٰ ابن الصلاح ۱/۴۶)

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنی جہالت کی وجہ سے ائمہ کرام خصوصاً امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کو حدیث کی مخالفت کا الزام دینے والوں کی خدمت میں امام ابن تیمیہ کی درج ذیل عبارت پیش کی جائے تاکہ وہ ان ائمہ پر طعن و تشنیع سے باز آجائیں اور حدیث قدسی میں مذکور من عادی لى و لیا فقد اذنتہ بالحرب کے قہر الہی سے خود کو بچالیں۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کی حفاظت فرمائیں۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

و ليعلم أنه ليس أحد من الأئمة المقبولين عند الأمة قبولا عاما يعتمد مخالفة رسول الله صلى الله عليه وسلم في شيء من سنته دقيق ولا جليل فإنهم متفقون اتفاقاً يقينا على وجوب اتباع الرسول.

(الفتاویٰ الکبریٰ ۲۰/۲۳۲)

یہ بات جان لینی چاہیے کہ مسلمانوں کے ہاں مقبول اماموں میں سے کوئی بھی جان بوجھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی کسی چھوٹی یا بڑی چیز میں مخالفت ہرگز نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ تو متفقہ طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم پیروی کے لازم ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر کسی امام سے کوئی ایسا قول منقول ہو کہ اس کے خلاف کوئی حدیث مل جائے تو اس امام سے بدگمان ہونے کی بجائے اس قول کے بارے میں تین عذروں میں سے کوئی ایک عذر اس امام کی طرف سے پیش کیا جائے گا۔

أحدها عدم اعتقاده أن النبي قاله والثاني عدم اعتقاده إرادة تلك المسألة بذلك القول والثالث اعتقاده أن ذلك الحكم منسوخ.

(الفتاویٰ الکبریٰ ۲۰/۲۳۳)

پہلا یہ کہ وہ امام اس کے مرفوع حدیث نہ ہونے کا اعتقاد رکھتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ممکن ہے اس امام کا یہ عقیدہ ہو کہ اس حدیث وہ مسئلہ نہیں نکلتا اور تیسرا یہ کہ ممکن ہے کہ اس امام کا اس حدیث کے منسوخ ہونے کا اعتقاد ہو۔

تمت بعون الله

حرره الراجی الی رحمة ربه الکریم عابد جمشید